سر سیّد احمد خاں

میر نجابت علی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

سلسلہ مصلحینِ جدید

سر سید احمد خاں

مصنفہ

میر نجابت علی

مترجم

سید ابوالحسنات

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

ویسٹ بلاک ۱ - آر کے پورم، نئی دہلی 110066

پہلی اشاعت	:	1973
چھٹی طباعت	:	2009
تعداد	:	1100
قیمت	:	-/7 روپے
سلسلۂ مطبوعات	:	777

Sir Syed Ahmad Khan

by

Meer Najabat Ali

ISBN :978-81-7587-314-8

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، آر. کے. پورم، نئی دہلی۔110066

فون نمبر: 26103938، 26103381، 26179657، فیکس: 26108159

ای۔میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: لاہوتی پرنٹ ایڈس، جامع مسجد، دہلی۔110006

اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

پیارے بچو! علم حاصل کرنا وہ عمل ہے جس سے اچھے بُرے کی تمیز آجاتی ہے۔ اس سے کردار بنتا ہے، شعور بیدار ہوتا ہے، ذہن کو وسعت ملتی ہے اور سوچ میں نکھار آجاتا ہے۔ یہ سب وہ چیزیں ہیں جو زندگی میں کامیابیوں اور کامرانیوں کی ضامن ہیں۔

ادب کسی بھی زبان کا ہو، اس کا مطالعہ زندگی کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ یہ کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ بچو! ہماری کتابوں کا مقصد تمھارے دل و دماغ کو روشن کرنا ہے اور ان چھوٹی چھوٹی کتابوں سے تم تک نئے علوم کی روشنی پہنچانا ہے، نئی نئی سائنسی ایجادات، دنیا کی بزرگ شخصیات کا تعارف کرانا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اچھی اچھی کہانیاں تم تک پہنچانا ہے جو دلچسپ بھی ہوں اور جن سے تم زندگی کی بصیرت بھی حاصل کرسکو۔

علم کی یہ روشنی تمھارے دلوں تک صرف تمھاری اپنی زبان میں یعنی تمھاری مادری زبان میں سب سے مؤثر ڈھنگ سے پہنچ سکتی ہے۔ اس لیے یاد رکھو کہ اگر اپنی مادری زبان اردو کو زندہ رکھنا ہے تو زیادہ سے زیادہ اردو کتابیں خود بھی پڑھو اور اپنے دوستوں کو بھی پڑھواؤ۔ اس طرح اردو زبان کو سنوارنے اور نکھارنے میں تم ہمارا ہاتھ بٹا سکو گے۔

قومی اردو کونسل نے یہ بیڑا اٹھایا ہے کہ اپنے پیارے بچوں کے علم میں اضافہ کرنے کے لیے نئی نئی اور دیدہ زیب کتابیں شائع کرتی رہے جن کو پڑھ کر ہمارے پیارے بچوں کا مستقبل تابناک بنے اور وہ اپنے بزرگوں کی ذہنی کاوشوں سے بھرپور استفادہ کرسکیں۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

ڈائرکٹر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

فہرست

صفحہ

باب

پہلا باب

ابتدائی زندگی

۷ اراکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی کے ایک معزز اور خوشحال گھرانے میں ایک ہونہار اور خاصہ صحت مند بچّہ پیدا ہوا جس کا نام سید احمد خاں رکھا گیا۔ اس کی پرورش بھی اُونچے گھرانوں کے بچّوں کی طرح ہوئی۔ لیکن اس وقت تندرست اور توانا ہونے کے علاوہ اس بچّے میں اور کوئی خاص بات نہیں تھی۔ نہ تو اس کو پڑھائی لکھائی کا شوق تھا اور نہ اس میں اور کوئی خاص خوبی تھی۔ کسی کو کیا پتہ تھا کہ یہ بچّہ آگے چل کر سر سید احمد خاں کے نام سے مشہور ہوگا اور دُنیا اُسے عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھے گی۔ آگے چل کر ہم اس کا ذکر سر سید کے نام سے کریں گے۔

مسلمان گھرانوں کے دستور کے مطابق سر سید کو پہلے قرآن مجید پڑھایا گیا۔ اس کے بعد انھوں نے فارسی اور عربی کی کچھ کتابیں پڑھیں۔ اُردو تو اُن کی مادری زبان تھی ہی۔ لڑکپن میں سر سید نے اپنا زیادہ وقت اس زمانے کی دلچسپیوں میں گذارا۔ اس وقت کے نوجوانوں کی طرح وہ بھی میلوں ٹھیلوں کی دُھوم دھام، تہواروں کی رونقوں، مجلسوں اور محفلوں کی صحبتوں میں شریک رہے۔ غرض کہ ان کی زندگی خوشیوں سے بھرپور تھی۔ وہ بے فکر اور آزاد رو تھے۔

وہ اپنے والد کے ہمراہ کبھی کبھی مغل دربار میں بھی جایا کرتے تھے۔ اس وقت بہادر شاہ ظفر بادشاہ تو تھے لیکن ان کے اختیارات بہت کم رہ گئے تھے۔ پھر بھی لال قلعہ میں ان کا دربار لگتا تھا۔ چونکہ سرسید ایک قدیم اور معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے، اِس لیے وہاں اُن کی اچھی خاصی آؤ بھگت ہوتی تھی۔

۱۸۳۸ء میں جب سرسید کے والد میر متقی کا انتقال ہوا تو اس سے ان کی زندگی میں ایک نمایاں تبدیلی واقع ہو گئی۔ میر متقی کی آمدنی کا دار و مدار زیادہ تر اُن کی پنشن اور مغل دربار سے عطا کی گئی جائیداد پر تھا جو اچانک بند ہو گئی۔ اس طرح اکیس ۲۱ سال کی عُمر میں سرسید کو تلاشِ معاش کی فکر دامن گیر ہوئی۔ چونکہ اُن کی تعلیم و تربیت معاشی ضرورت کے پیشِ نظر نہیں کی گئی تھی، اِس لیے ان کے لیے یہ اور بھی بڑا مسئلہ تھا۔ سرسید کے چچا دہلی میں ایک سرکاری عہدے پر تھے۔ سرسید نے ان کے ہی دفتر میں قانون پڑھنا شروع کیا اور بعد میں کلرک کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔

اس وقت رابرٹ ہملٹن دہلی میں جج کے عہدہ پر فائز تھے۔ وہ سرسید اور ان کے خاندان کو جانتے تھے۔ انھوں نے سرسید کو سیشن کورٹ میں سپرنٹنڈنٹ کا عہدہ پیش کیا لیکن انھوں نے اس کو قبول کرنے سے اِنکار کر دیا۔ انھیں اِحساس تھا کہ وہ قانون کی واقفیت زیادہ نہیں رکھتے ہیں اور اس لیے اپنی ذمہ داریوں کو اچھی طرح نہیں نبھا سکتے۔ بہر حال ۱۸۳۹ء میں جب انھیں آگرہ میں کمشنر کے دفتر میں کلرک کی نوکری دی گئی تو انھوں نے اس کو منظور کر لیا۔

آگرہ میں انھوں نے قانون کا مطالعہ جاری رکھا۔ انھوں نے منصفوں کے لیے دیوانی قانون کا خلاصہ تیار کر کے حکومت کو پیش کیا۔ اسی زمانے میں حکومت نے منصف کے عہدہ کے لیے ایک امتحان لیے جانے کا فیصلہ کیا۔ سرسید اس امتحان میں بیٹھے اور کامیاب ہوئے۔ ۱۸۴۱ء میں ان کا تقرر مین پوری کے

منصف کی حیثیت سے ہوا اور ۱۸۴۲ء میں ان کا تبادلہ فتح پور سیکری کر دیا گیا۔

سرسید نے دیوانی قانون کا جو خلاصہ تیار کیا تھا وہ شائع ہونے کے بعد بہت مقبول ہوا اور کئی برسوں تک منصف کے امتحان کے امیدوار کے لیے اس خلاصے کو نصابی کتاب کی حیثیت حاصل رہی۔

اس سے قبل ۱۸۴۰ء میں سرسید نے ایک اور کتاب لکھی تھی جس کا نام 'جامِ جم' تھا۔ اس کتاب میں انھوں نے تیمور سے بہادر شاہ تک کے زمانے کے تمام مغل بادشاہوں کے حالات مختصراً بیان کیے تھے۔ یہ چھوٹی سی کتاب ان کی اس ادبی سرگرمی کی ابتدا تھی جس کو انھوں نے آخر دم تک جاری رکھا۔ کہا جاتا ہے کہ اگر ان کی تمام کتابیں اور مضامین اکٹھا کر دیے جائیں تو ان سے ایک چھوٹی سی لائبریری بن سکتی ہے۔

۱۸۴۶ء میں سرسید کا تبادلہ دہلی ہو گیا۔ ان کے بڑے بھائی مُنصِف تھے اور سرسید کے ساتھ ان پر بھی خانگی ذمہ داریوں کا بوجھ تھا لیکن اچانک ان کا انتقال ہو گیا اور پورے کنبے کی ذمہ داری سرسید کے اُوپر آ گئی۔ اس وقت ان کی تنخواہ ایک سو روپیہ ماہوار تھی۔ یہ ساری رقم وہ اپنی والدہ کو دے دیتے تھے اور وہ اس میں سے صرف پانچ روپیہ انھیں جیب خرچ کے لیے دے دیتی تھیں۔

سرکاری اور خانگی ذمہ داریوں کے باوجُود سرسید نے شہر دہلی اور اس کے اطراف کی قدیم عمارتوں اور تاریخی مقامات کے تحقیقی مطالعے کے لیے وقت نکالا اور اس طرح اپنے قیامِ دہلی کا بھرپُور فائدہ اُٹھایا۔ اس قسم کے کام کے لیے انھوں نے کوئی باقاعدہ ٹریننگ حاصل نہیں کی تھی لیکن جب انھوں نے اس کام کو انجام دینے کا ارادہ کر لیا تو اس کام کے سلسلہ کی ضروری معلومات کے ساتھ ساتھ ان کا تجربہ بھی بڑھتا گیا۔ صحیح حالات کی تحقیق کے لیے انھوں نے تاریخ اور قدیم دستاویزات

کا مطالعہ کیا۔ انھوں نے قدیم کتبات کو پڑھنے اور سمجھنے میں بڑی محنت کی اور ان کی صحیح صحیح نقلیں اتاریں۔ ۱۸۴۷ء میں کتاب مکمل ہو کر شائع ہوئی۔ اِس کتاب کا نام "آثارُ الصّنادید" رکھا گیا۔ اس میں نہ صرف قدیم عمارتوں کی تفصیلات بیان کی گئی تھیں بلکہ دہلی کے سلاطین اور یہاں کی سرکردہ اور اہم شخصیتوں کے مختصر حالاتِ زندگی بھی تحریر کیے گئے تھے۔ شاہ جہان پور کے کلکٹر اور مجسٹریٹ مسٹر رابرٹسن اس وقت چھٹی لے کر انگلستان جا رہے تھے اپنے ساتھ اس کی ایک نقل لے گئے اور اسے ایشیاٹک سائٹی (لندن) کو پیش کیا۔ اس سوسائٹی کے ممبروں نے اس کو بے حد پسند کیا اور انگریزی زبان میں اس کا ترجمہ کرانے کی خواہش ظاہر کی۔ ہندوستان واپس ہونے کے بعد مسٹر رابرٹسن نے یہ تجویز سرسید کے سامنے پیش کی۔ سرسید نے ترجمے سے پہلے اس پر نظرِ ثانی کی اور اس میں کافی ترمیم و تنسیخ اور اضافے کیے لیکن ابھی ترجمے کا یہ کام ہو ہی رہا تھا کہ بدقسمتی سے اس نسخے کی تمام کاپیاں ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں (۱۸۵۷ء کے واقعات کے بارے میں ہم اگلے باب میں پڑھیں گے) ضائع ہو گئیں لیکن اتفاق سے ایک فرانسیسی ادیب کو اس کا ایک نسخہ دستیاب ہو گیا۔ ۱۸۶۱ء میں اس نے فرانسیسی زبان میں اس کا ترجمہ کیا اور اس کی ایک جلد سرسید کے نام روانہ کی۔ اس ترجمہ کو رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے بھی دیکھا اور ۱۸۶۴ء میں سرسید کو اس سوسائٹی کا اعزازی رکن بنا کر ان کی عزّت افزائی کی۔

والد اور بھائی کا سایہ سر سے اُٹھ جانے کے بعد گھر کی تمام ذمہ داریوں کا بوجھ سرسید کے کندھوں پر آ گیا جس نے ان کی زندگی ہی بدل کر رکھ دی۔ اب وہ ایک آزاد اور بے فکر نوجوان نہ تھے بلکہ ایک سنجیدہ عالم اور بُرد بار مُفکّر تھے۔ رفتہ رفتہ انھوں نے ایک ماہرِ تعلیم اور ایک عظیم مُصلح کی حیثیت اختیار کر لی لیکن قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ اس کے پیچھے نام و نمود کی خواہش یا ذاتی مفاد کا کوئی جذبہ کارفرما نہیں تھا۔ بعد کو ان کی ساری زندگی جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے ملک اور قوم کی بے لوث خدمت کے لیے وقف ہو گئی۔

دوسرا باب

۱۸۵۷ء کا انقلاب

۱۸۵۷ء کی بغاوت سے شمالی ہند کے مسلمانوں کو بہت بڑا صدمہ پہنچا۔
اس بغاوت کی سب سے بڑی وجہ فوج کی بے چینی اور عوام کی بے اطمینانی تھی۔ پروفیسر
تارا چند اپنی کتاب A SHORT HISTORY OF THE INDIAN PEOPLE
(ہندوستانی عوام کی مختصر تاریخ) میں لکھتے ہیں " اس بغاوت کا فوری سبب اصل
میں فوجیوں میں تقسیم ہونے والے وہ کارتوس تھے جن کے بارے میں یہ مشہور ہو گیا
تھا کہ ان میں گائے اور سوّر کی چربی استعمال کی گئی ہے۔ اس بات نے ہندو اور مسلمان
فوجیوں کو مشتعل کر دیا اور انھوں نے انگریزوں کو اپنے دھرم اور ایمان کا دشمن سمجھ کر
برطانوی حکومت کا تختہ الٹنے کا فیصلہ کر لیا۔
۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو یہ طوفان میرٹھ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ہندوستانی فوجیوں نے
بغاوت کر دی۔ انھوں نے اسٹیشن کو جلایا، عیسائیوں کو قتل کیا اور پھر وہ دہلی کی
طرف بڑھنے لگے۔ یہاں انھوں نے ۸۲ سالہ بادشاہ بہادر شاہ کو اپنا حکمران بنایا۔
ایک ماہ کے اندر اندر الہ آباد سے ستلج تک ہر فوجی دستے نے بغاوت کر دی۔
اس وقت کے صوبے " ریاستہائے متحدہ آگرہ واودھ " کے نظم ونسق میں انتشار

پیدا ہو گیا اور حکومت معطل اور مفلوج ہو کر رہ گئی۔ کانپور میں ایک برطانوی جنرل اور تقریباً دو سو یورپی لوگوں کو گھیر لیا گیا۔ انھوں نے تھوڑی دیر تک تو مقابلہ کیا لیکن بعد میں معاہدہ کر کے ہتھیار ڈال دیے۔ انھیں کانپور چھوڑ کر کشتیوں سے چلے جانے کی اجازت دے دی گئی۔ مگر بعد کو ان کشتیوں پر باغیوں نے گولیاں چلا دیں اور ان میں سے بہت سے لوگ گنگا میں ڈوب گئے۔

جھانسی کی رانی پر حکومت نے بڑی سختی کی تھی چنانچہ اس نے بھی بغاوت کر دی۔ وہ اپنی فوجوں کی قیادت کرتی ہوئی قلعہ سے باہر نکلی۔ اس کی فوج برطانوی فوجوں کا بڑی بہادری سے مقابلہ کر رہی تھی لیکن دشمن کی فوج کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ رانی ان کے غلبہ میں آگئی اور لڑتی ہوئی ماری گئی۔

اس بغاوت کے وقت سر سید بجنور میں تھے۔ یہاں باغیوں نے تقریباً بیس یورپی باشندوں کو گھیر لیا۔ وہ انھیں مار ڈالنا چاہتے تھے۔ سر سید نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر باغیوں کے سرغنے نواب محمود خاں سے بات چیت کی۔ انھوں نے نواب کو سمجھایا کہ اگر آپ چاہیں تو شہر پر قبضہ کر سکتے ہیں لیکن ان چند یورپین کو جن میں زیادہ تر عورتیں اور بچے شامل ہیں قتل کرنے سے کیا فائدہ حاصل ہوگا۔ سر سید کی گفتگو کا کچھ ایسا اثر ہوا کہ محمود خاں نے ان لوگوں کو بغیر کسی نقصان کے شہر سے نکل جانے کی اجازت دے دی۔

سر سید یہیں رُکے رہے حالانکہ ان کی جان کو بڑا خطرہ تھا۔ جلد ہی اس بغاوت میں انتشار پیدا ہو گیا اور آپس میں لڑائیاں شروع ہو گئیں۔ سر سید نے حالات کو قابو میں رکھنے کی بہت کوشش کی لیکن ان کا مکان لُوٹ لیا گیا اور انھیں اپنی جان بچانے کے لیے شہر چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔ آخر وہ نہایت پھٹے حال میں یہاں سے میرٹھ پہنچے۔ میرٹھ میں سر سید نے پانچ مہینے قیام کیا۔ پھر انھیں اپنے رشتہ داروں کی تلاش میں

دہلی جانے کا موقع ملا۔ ان کے چچا مارے گئے تھے لیکن ان کی والدہ اور خالہ زندہ تھیں۔ ان کا مکان لُٹ چکا تھا اور اب وہ ایک چھوٹے سے کمرے میں چھُپے ہوئے تھے اور فاقے کر رہے تھے۔ سر سید انھیں میرٹھ لے گئے۔ ان کی بوڑھی ماں پر جو مصیبتیں آئی تھیں انھیں جھیلنے کی ان میں سکت نہ تھی۔ وہ میرٹھ آنے کے چند ہی دنوں بعد چل بسیں۔

انگریز افسروں نے جہاں جہاں بغاوت ہوئی تھی اُن علاقوں کے مسلمانوں کو اپنے اِنتقام کا نشانہ بنایا۔ انھوں نے ہزاروں لوگوں کو گولی سے اُڑا دیا۔ ان کی جائیدادیں اور زمینیں ضبط کر لیں۔ تقریباً ہر مسلمان کو باغی قرار دے دیا اور اس کے ساتھ باغی جیسا سلوک کیا گیا۔ البتہ چند لوگ ایسے تھے کہ جنھیں جان سے نہیں مارا گیا، لیکن ان کا سارا مال و اسباب چھین لیا گیا تھا اور ان کی حالت ان لوگوں سے بھی بدتر تھی جو موت کے گھاٹ اُتار دیے گئے تھے۔

بجنور کے زمانۂ قیام میں سر سید، باغیوں اور دوسرے افراد کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی تھی، سر سید نے اُسے محفوظ کر لیا تھا۔ انھوں نے ان خطوط کے ذریعے کئی ہندوؤں اور مسلمانوں کی جانیں بچائیں۔ انھوں نے کہا کہ صرف انھیں لوگوں کو باغی قرار دینا چاہیے جو برطانوی فوجوں کے خلاف جنگ میں عملی طور سے شریک ہوتے ہیں اور ان لوگوں کو باغی قرار نہ دیا جائے جنھیں اس بغاوت میں شریک ہونے یا لڑائی میں شامل ہونے پر مجبور کیا گیا ہو۔ اس سلسلہ میں انھوں نے بہت سے ایسے خطوط پیش کیے جس کی وجہ سے بہت سے لوگوں کی بے گناہی ثابت ہوئی اور بہت سی جانیں بچ گئیں۔

سر سید نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کے خلاف انگریزوں کے غیظ و غضب اور ان کی نفرت کا اصل سبب محض غلط فہمی تھی۔ انگریزوں کے ذہن نشین یہ

بات کرادی گئی تھی کہ یہ بغاوت دراصل پھر سے مغل حکومت قائم کرنے اور انگریزوں کو یہاں سے نکالنے کے لیے مسلمانوں کی ایک زبردست سازش کا نتیجہ تھی۔ سرسید نے اس غلط فہمی کو دور کرنے کا تہیہ کرلیا۔ جب ان کا تبادلہ مُرادآباد ہوا تو انھوں نے کچھ دنوں کے بعد بغاوت کی خاص وجوہات پر ایک کتاب لکھی۔ ۱۸۵۹ء میں انھوں نے اس کی پانچ سو جلدیں طبع کرائیں۔ ان کے قریبی دوست رائے شنکرداس نے جو اس وقت مُرادآباد میں منصف تھے یہ کتاب پڑھی اور سرسید کو ان تمام جلدوں کو جلا دینے کا مشورہ دیا۔ ان کا خیال تھا کہ انگریز اس کتاب کو پڑھ کر یقیناً سرسید کو بھی باغی قرار دے دیں گے اور انھیں جان سے مار ڈالیں گے لیکن سرسید ڈرنے والے نہیں تھے۔ انھوں نے چند جلدیں اپنے پاس رکھیں، ایک جلد حکومت کو پیش کی اور باقی تمام جلدیں انگلستان بھیج دیں۔ یہ جلدیں انڈیا آفس، اراکین پارلیمنٹ اور ہندوستان کے حالات سے دلچسپی رکھنے والے دوسرے افراد میں تقسیم کردی گئیں۔ اس کتاب کا اردو سے انگریزی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ پڑھنے والوں کے لیے یہ نئے حقائق بڑے حیران کُن تھے۔

سرسید نے بڑی جرأت کے ساتھ حکومت کو اس بغاوت کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ انھوں نے مثالیں دے کر ثابت کیا کہ حکومت عوام کے جذبات کا صحیح اندازہ نہیں کر سکی۔ حکومت نے کئی ایسے قانون نافذ کیے جو لوگوں کی تہذیب و معاشرت اور روایات کے خلاف تھے۔ سرسید نے عیسائی مبلغوں کی ان کارروائیوں کی طرف بھی اشارہ کیا جنھوں نے ہندوستانیوں کے دلوں میں بدگمانیاں پیدا کردی تھیں اور جنھیں حکومت کی سرپرستی حاصل تھی۔ سرسید نے یہ بھی کہا کہ اگر قانون ساز اسمبلیوں میں ہندوستانیوں کو شریک کیا جائے اور ان سے بھی ملک کے آئین مرتب کرنے میں تعاون لیا جائے تو آئندہ ان خامیوں کا ازالہ ہوسکتا ہے۔

اس کتاب نے انگریزوں کی آنکھیں کھول دیں۔ ہمیں یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ انگریزوں نے غلط اثر لینے کی بجائے ان میں سے بہت سی تجویزوں کو منظور کر لیا اور انھیں تجویزوں پر بعد کی بہت سی اصلاحات کی بنیاد رکھی گئی۔ اس کتاب نے اعلیٰ حلقوں میں سرسید کی شہرت کو چار چاند لگا دیے۔ ساتھ ہی اس نے اس غلط فہمی کو بھی دور کر دیا کہ مسلمانوں نے ہندوستان میں مغل حکومت کو دوبارہ قائم کرنے کی سازش کی تھی۔ مسلمانوں کے بارے میں انگریزوں کی بدگمانی اور ان کا غم و غصہ بھی ختم ہو گیا اور سرسید نے حکومت کا اعتماد حاصل کر لیا۔

۱۸۶۰ء میں مُراد آباد میں ایک بہت بڑا قحط پڑا تھا۔ اس کا امدادی کام سرسید کے سُپرد کیا گیا۔ انھوں نے تمام مصیبت زدوں کی جن میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی، دیکھ بھال اتنی اچھی طرح کی کہ ایک معزز ہندو راجہ جے کشن داس سی۔ ایس۔ آئی سرسید کی تندہی دیکھ کر زندگی بھر کے لیے ان کے دوست اور معترف ہو گئے۔

ان دنوں بھوک اور فاقے سے پریشان ہو ہو کر لوگ اپنے بچّوں کو دوسرے لوگوں کو دینے لگے تھے۔ سرسید اس افسوسناک صورتِ حال سے بہت متاثر ہوئے۔ سرسید نے ان بچّوں کو بڑے گھرانوں میں تقسیم کروایا۔ اس تقسیم میں انھوں نے اِس بات کا بھی خیال رکھا کہ ہندو بچّہ ہندو گھرانے میں اور مسلمان بچّہ مسلمان گھرانے میں رہے۔ انھوں نے ان بچّوں کو اپنانے والے لوگوں سے یہ ضمانت بھی لی کہ وہ ان بچّوں سے غلاموں کی طرح سلوک نہیں کریں گے اور بڑے ہونے پر انھیں اپنی مرضی کے مطابق زندگی گذارنے کی آزادی ہوگی۔ مسٹر جان اسٹریچی نے جو اس وقت اس ضلع کے کلکٹر تھے اور جو بعد میں صوبہ سرحد کے لفٹننٹ بنے، سرسید کی اس کارگذاری کو پسند کیا۔

لیکن جب مسٹر اسٹریچی کا تبادلہ ہوا اور ان کی جگہ ایک نئے کلکٹر نے لی تو عیسائی مشن والوں نے ان تمام بچّوں کو اپنے زیرِ تربیت رکھنا چاہا۔ وہ بچے جنھیں سرسید

نے ہندوستانی گھرانوں کے سپرد کیا تھا انھیں بھی واپس بُلا کر ان عیسائی مشن والوں کے حوالے کر دیا گیا۔ سرسید نے اس بات کو روکنے کی مقدور بھر کوشش کی لیکن وہ مجبور تھے۔ انھوں نے سوچا کہ اس صورت میں بہتر طریقہ یہ ہوگا کہ کسی مرکزی مقام پر بڑا سا یتیم خانہ قائم کیا جائے وہاں ان کو سر چھپانے کی جگہ بھی مل جائے گی اور ان کی دیکھ بھال بھی خود ہندوستانی کر سکیں گے۔ سرسید نے نہایت عزم و استقلال کے ساتھ اپنے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی لیکن انھوں نے دیکھا کہ کچھ اور کام بھی ہیں جو اتنے ہی ضروری ہیں اور فوری توجہ کے مستحق ہیں۔ ان کاموں کو پورا کرنے کے لیے لیڈروں اور کارکنوں کی ایک پوری جماعت کی ضرورت تھی۔ سوال یہ تھا کہ یہ جماعت آئے کہاں سے ؟

ان کی نظر میں اس مشکل کا ایک واحد حل یہی تھا کہ سب سے پہلے عوام کو اس کا احساس دلایا جائے۔ اگر انھیں اس قسم کی تعلیم دی جائے تو وہ خود ان مسئلوں پر توجہ دینے لگیں گے اور ترقی یافتہ ملکوں کی طرح یہ لوگ نہ صرف خود اس کے لیے حتی المقدور کوشش کریں گے بلکہ حکومت کو بھی وقتِ ضرورت عمل کرنے پر مجبور کریں گے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ تعلیم پہلی اور سب سے اہم ضرورت ہے۔ انھوں نے اپنی بقیہ زندگی اس تعلیم کے لیے وقف کر دی۔

۱۸۶۱ء میں سرسید کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد انھوں نے دوبارہ شادی نہیں کی۔

تیسرا باب

تعلیم اور سرسیّد

سرسید ہندوستانیوں کے لیے بہترین قسم کی تعلیم چاہتے تھے۔ وہ ایسی تعلیم چاہتے تھے جو ہندوستانیوں کو دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کی صف میں شامل کردے۔ حکومت کے بہت سے دفاتر اور عدالتوں کی زبان اردو تھی اس لیے سرسید کا پہلا خیال یہ تھا کہ ایک ایسی یونی ورسٹی قائم کی جائے جہاں اعلیٰ تعلیم اردو زبان میں دی جائے لیکن بہت جلد انھیں اس بات کا احساس ہوگیا کہ کسی ہندوستانی زبان میں اتنا لٹریچر موجود نہیں ہے جو اعلیٰ تعلیم کی ضرورتوں کو پورا کرسکے یا جس کے ذریعے جدید سائنسی علوم کی تعلیم دی جاسکے۔ یورپ میں سائنسی علوم کی تعلیم کا دَور دَورہ تھا۔ سائنسی علوم یہاں بہت ترقی کرچکے تھے۔ یورپی اقوام سائنسی ایجادات کے ذریعے ایشیا اور افریقہ پر اپنا تسلّط جمانے لگی تھیں۔ برطانیہ نے ایک عظیم سلطنت قائم کرلی تھی۔ انگریزی جاننے والوں کے لیے علم کا ہر راستہ کھلا ہوا تھا۔ ان سب باتوں کو دیکھ کر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ہندوستانیوں کے لیے بہترین ذریعۂ تعلیم انگریزی رہے گی۔ ورنہ ہندوستانی زبانوں میں تعلیم حاصل کرنے سے لوگ صرف کلرک بنیں گے۔ انگریزی زبان کے ذریعے انھیں جدید علم کے خزانے ملیں گے اور وہ اعلیٰ عہدوں

اور بڑی ذمہ داریوں کے قابل بن سکیں گے۔ اس لیے سرسید نے ۱۸۵۹ء میں حکومت کو یہ تجویز پیش کی کہ سرکاری اسکولوں میں تعلیم صرف انگریزی زبان میں ہی دی جائے۔ ابھی سرسید ان خطوط پر سوچ رہے تھے اور کام کر رہے تھے کہ ایک احتجاجی تحریک کا آغاز ہو گیا جس میں مطالبہ کیا گیا کہ سرکاری دفاتر اور عدالتوں میں فارسی رسم الخط میں اردو کی بجائے دیوناگری رسم الخط میں ہندی جاری کی جائے۔ جب سرسید نے دونوں طرف اس کشمکش کو بڑھتے ہوئے دیکھا تو انھیں بڑی مایوسی ہوئی اس وقت جب جذبات کے دھارے کا رُخ تو ہندوستانی زبانوں کو ہٹا کر انگریزی کو اپنانا تھا ان کی تجویز پر کون غور کر سکتا تھا ؟ اگر وہ اپنے خیال پر اڑے رہتے تو انھیں دو محاذوں پر مقابلہ کرنا پڑتا اور انھیں کچھ حاصل نہ ہوتا۔

اس دشواری سے نجات حاصل کرنے کے لیے انھوں نے یہی سوچا کہ وہ اپنی اسکیم کو وسیع تر بنانے کی بجائے محدود اور مختصر کر دیں۔ انھوں نے پہلے پہل انگریزی تعلیم تمام ہندوستانیوں کے لیے اپنانے کی جو اسکیم بنائی تھی اس کو ترک کر دیا اور صرف مسلمانوں کی تعلیم کے بارے میں سوچنے لگے۔ بہ ہر حال مسلمانوں کو تعلیم کی فوری ضرورت تھی۔ ہندوؤں نے تو تقریباً چالیس۴۰ سال پہلے سے انگریزی تعلیم حاصل کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان میں سے کئی لوگ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے بیرونی ممالک بھی جا چکے تھے۔ اس کے برخلاف مسلمان مولویوں کے زیر اثر انگریزی سیکھنے کو گناہ سمجھتے رہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی قابلِ لحاظ تھی ایک ہی محاذ پر لڑنے میں ان کی اسکیم کی کامیابی کے زیادہ امکانات تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کو انگریزی سکھانے کے لیے ایک کالج قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ حالانکہ انھیں اس کا بخوبی علم تھا کہ مولوی صاحبان ان کی مخالفت کریں گے۔

ایک دن جب وہ اپنے ضلعے کے کلکٹر مسٹر شیکسپیئر سے اس مسئلہ پر گفتگو

کر رہے تھے تو انھوں نے کہا کہ یہ پہلا موقع ہے جب کہ آپ صرف مسلمانوں کے لیے کوئی منصوبہ بنا رہے ہیں۔ حالانکہ اب تک آپ ہمیشہ تمام ہندوستانیوں کے بارے میں سوچا کرتے تھے۔ لیکن جب سرسید نے اپنی دشواریوں اور خدشات کا ذکر کیا تو مسٹر شیکسپیئر نے اپنے نقطۂ نظر پر اصرار نہیں کیا۔ کالج کا قائم کرنا کوئی آسان یا معمولی کام نہ تھا۔ اس سلسلہ میں کوئی قدم اٹھانے سے پہلے وہ انگلستان جاکر وہاں کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں کو دیکھنا چاہتے تھے۔

خوش قسمتی سے سرسید کے بیٹے سید محمود کو انگلستان میں قانون پڑھنے کے لیے سرکاری وظیفہ مل گیا۔ سرسید نے اپنا بیش بہا کتب خانہ فروخت کر ڈالا اور اپنا مکان رہن رکھ دیا۔ اس سے جو رقم ملی اس کے ذریعے وہ اپنے دوسرے بیٹے سید حامد کو ساتھ لے کر سید محمود کے ہمراہ اپریل ۱۸۶۹ء میں بذریعہ ہوائی جہاز انگلستان روانہ ہو گئے۔

انگلستان کے بہترین حلقوں میں سرسید کا چرچا پہلے ہی سے تھا۔ انگلستان میں بہت سی ممتاز شخصیتوں نے ان کا استقبال کیا۔ انھیں متعدد جلسوں اور تقریبوں میں مدعو کیا گیا۔ ملکہ اور پرنس آف ویلس کی شاہی تقریبوں میں انھوں نے شرکت کی۔ ۲۶ راگست ۱۸۶۹ء میں انھیں سی۔ ایس۔ آئی (کمپینین آف دی اسٹار آف انڈیا) کا خطاب دیا گیا۔ ۱۸۷۰ء میں اتھانیم کلب (Athenaeum Club). نے انھیں اپنی اعزازی رکنیت کی پیش کش کی۔ یہ ایک مخصوص قسم کا کلب تھا جس میں انتہائی مشہور و معروف شخصیتوں میں سے صرف ۱۲۰۰ کو اس کا ممبر بننے کی اجازت تھی۔ جس وقت سرسید کو اس کا اعزازی رکن بنایا گیا اُس وقت ۳ ہزار اشخاص کئی برسوں سے اس کے رُکن بننے کے اُمیدوار تھے۔ انگلستان میں انھیں جتنے اعزازات بخشے گئے اُن میں وہ اس کلب کی رُکنیت کو اعلیٰ ترین اعزاز تصوّر کرتے تھے۔

سرسید نے انگریزی رہن سہن اور یہاں کی تعمیر و ترقی کا ہر پہلو سے مطالعہ کیا۔

کیمبرج یونیورسٹی میں انھوں نے جو کچھ دیکھا اُسے انھوں نے یادداشت کے طور پر لکھ لیا۔ اپنے انگلستان کے دَورِ قیام میں انھوں نے ایک اور اہم کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ سر ولیم مئویر نے لائف آف محمد کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جس میں انھوں نے اسلام اور پیغمبرِ اسلام پر کڑی تنقید کی تھی۔ جب سر سید ہندوستان میں تھے وہ اسی وقت جواب دینا چاہتے تھے لیکن اس کے لیے وہ جن قدیم کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہتے تھے وہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں ضائع ہو چکی تھیں۔ اس کام کو انھوں نے انگلستان میں پورا کرنے کا فیصلہ کیا جہاں انھیں انڈیا آفس لائبریری اور برٹش میوزیم کی کتابیں دیکھنے کی سہولتیں حاصل تھیں۔ سر سید نے نہ صرف یہ کتاب لکھی بلکہ اس کا انگریزی زبان میں ترجمہ بھی کرالیا اور انگلستان میں ہی روانگی سے قبل اُس کو شائع کروا دیا۔ سر سید کو اپنی محنت کا پورا انعام اُن کی کتاب خطباتِ احمدیہ کی زبردست مقبولیت سے مل گیا۔ مئویر اور دیگر عیسائی مصنفوں نے اسلام اور پیغمبرِ اسلام پر جو الزامات عائد کیے تھے ان کی سر سید نے مکمل طور پر تردید کی۔ اس کتاب پر بہت سے تحسین آمیز تبصرے شائع ہوئے۔

انگلستان میں ایک سال ۵ مہینے کے قیام کے بعد سر سید ہندوستان واپس گئے۔ وہ تعلیم کے بارے میں اپنے خیالات کو واضح شکل دے چکے تھے اب صرف اس پر عمل کرنا باقی تھا۔ سر سید کا یہ خیال کہ وہ مولویوں کو آسانی سے اپنی طرف کھینچ لیں گے بالکل غلط ثابت ہوا۔ سر سید کے خلاف مولویوں نے آواز بلند کی۔ ان کے سوچنے کا انداز صدیوں سے ہی پُرانا تھا۔ اُن کے لیے یہ سمجھنا مشکل تھا کہ نئے حالات اور نئے نئے مسائل پیدا ہو چکے ہیں اور اگر مسلمان زندہ رہنا چاہتے ہیں تو انھیں ان کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ ہر نئے خیال کو بدعت تصور کرتے تھے۔ سر سید کو کافر، مرتد اور دشمنِ اسلام کہا گیا۔ اُن کے ہر کام اور اُن کی ہر بات کو غلط معنی پہنائے گئے۔ چند مولویوں نے تو سر سید

کے خلاف مکّہ اور مدینہ کے علما سے فتوے منگوائے تھے۔

اس احتجاج کا مقابلہ کرنے کے لیے سرسید نے ایک اخبار 'تہذیب الاخلاق' جاری کیا جس میں وہ ان سوالوں کا جواب دیتے رہے اور اپنے کام کے تمام پہلوؤں کی تشریح کرتے رہے۔ اس کام میں ان کا بہت وقت صرف ہوتا تھا اور انھیں محنت بھی بہت کرنا پڑتی تھی مگر بہ ہر حال یہ کام ضروری تھا۔

اس کے بعد کالج کی عمارت کے لیے زمین اور رقم کا مسئلہ سامنے آیا۔ کافی دشواریوں کے بعد انھیں زمین ملی۔ آج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اسی جگہ پر قائم ہے۔ روپیہ کی فراہمی کے لیے انھیں ہندوستان بھر سے چندے اور عطیات جمع کرنے پڑے۔ اس سلسلہ میں جو جِدّوجُہد سرسید نے کی اور جو جو قربانیاں اُنھوں نے دیں۔ ان کا بیان اس مختصر سی کتاب میں نہیں کیا جا سکتا۔

جیسے جیسے رقم جمع ہونے لگی کالج کی تعمیر کا کام شروع کر دیا گیا۔ سرسید چاہتے تھے کہ یہ عمارتیں خوبصورت، شاندار اور پُر وقار ہوں۔ سرسید خود ہی ان عمارتوں کے نقشے بناتے تھے۔ وہ خود ہی انجنیر تھے اور خود ہی ٹھیکیدار۔ علی گڑھ کی جھلستی ہوئی دھوپ میں انھوں نے مزدوروں کے ساتھ کھڑے ہو کر اس عمارت پر اینٹ رکھوائی۔ اس کالج کا نام محمڈن اینگلو اورینٹل کالج رکھا گیا۔ اس میں تعلیم کا باقاعدہ کام ۱۸۷۸ء میں شروع ہوا۔ حالانکہ اس سے ۳ سال قبل اس کا آغاز اسکول کی شکل میں ہو چکا تھا۔ اس کے لیے کئی لائق و فائق انگریز اساتذہ رکھے گئے۔ ۱۸۸۳ء میں انڈین ایجوکیشن کمیشن نے اس کے معائنہ کے بعد لکھا کہ "یہ ادارہ بعض حیثیتوں سے ہندوستان کے دوسرے تعلیمی اداروں سے کہیں بہتر ہے۔"

کالج میں دو شعبے قائم کیے گئے۔ ایک انگریزی کا اور دوسرا شرقیہ کا علوم شرقیہ کے شعبے میں طلبا کی تعداد کچھ برسوں میں اساتذہ کی تعداد سے بھی کم ہوگئی۔ اس کے

برخلاف انگریزی کے شعبے میں داخلے کے لیے کافی بھیڑ رہی۔ ہندوستان بھر کے طلبا نے یہاں کا رُخ کیا۔ تمام مذہبوں، ذاتوں اور طبقوں کے طالب علم بغیر کسی روک ٹوک کے یہاں داخلے لے سکتے تھے۔

سرسید نے اپنی زندگی کے آخری زمانے میں جو خدمات انجام دیں ان کا ذکر کیے بغیر اس بات کو ختم کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ اپنے انگلستان کے دوران قیام میں انھوں نے وہاں کی زندگی کے ہر شعبے میں جو ترقی دیکھی تھی اس سے وہ بہت متاثر ہوئے تھے لیکن ان کی دوربین نگاہوں سے وہاں کے عوام کی اخلاقی پستی اور مذہبی زوال بھی چھپا ہوا نہیں تھا۔ انھیں یہ سوچ کر پریشانی ہوتی تھی کہ انگریزی طرز کی یہ تعلیم کہیں ہندوستانی مسلمانوں پر بھی اس قسم کے اثرات نہ ڈالے۔

لیکن سرسید جیسا کہ وہ خود کہا کرتے، صرف اس لیے مسلمان نہیں تھے کہ انھوں نے ایک مسلم گھرانے میں آنکھ کھولی تھی۔ انھوں نے مذہب کے تمام پہلوؤں کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور انھیں اسلام ہر لحاظ سے بہتر اور قابلِ قبول مذہب نظر آیا تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ قرآن ہر چیلنج کا مقابلہ کرسکتا ہے اور ہر دَور میں اپنی افادیت اور فوقیت ثابت کرسکتا ہے۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ اگر نوجوان شک وشبہات کے لمحات میں صرف قرآن کی طرف رجوع کریں تو وہ محفوظ رہ سکتے ہیں۔

سرسید یہ بھی سمجھتے تھے کہ قرآنی تعلیمات کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے مسلم نوجوانوں کو تھوڑی بہت رہنمائی کی ضرورت ضرور ہوگی۔ قرآن مجید کی قدیم تفسیریں چاہے وہ کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہوں موجودہ حالات اور موجودہ مسائل کے لیے نہیں لکھی گئی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ قرآنی تعلیمات اگر ان کی صحیح تاویل کردی جائے تو وہ آج کے مسائل کو بھی حل کرسکتی ہیں۔ اسی لیے انھوں نے قرآن کی ایک نئی تفسیر خود لکھنے کا بیڑا اٹھایا۔ یہ ایک زبردست کام تھا لیکن اس سے وہ پیچھے نہیں ہٹے۔ مرنے سے پہلے وہ ۱۸۶۸ء میں اس کا تین چوتھائی حِصّہ مکمل کرچکے تھے۔

چوتھا باب

ہندوستان کا عظیم سپوت

قدرت نے سرسید کو لامحدود صلاحیتیں عطا کی تھیں۔ وہ تحریر و تقریر دونوں میں انتہائی مہارت رکھتے تھے۔ ان میں صحیح فیصلہ کرنے اور ہمت نہ ہارنے کی خوبیاں موجود تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان میں مقصد کی پاکیزگی، جذبۂ خدمت اور خلوص و ایثار بدرجۂ اتم موجود تھا۔

اِس لیے یہ امر حیرت انگیز نہیں کہ انھوں نے اپنی ہر کوشش میں کامیابی حاصل کی۔ وہ سیاست دان، ماہرِ تعلیم، سماجی اور مذہبی مصلح، تاریخ دان اور معلّمِ دینیات تھے۔ وہ ہر میدان کے شہسوار تھے۔ انھوں نے ہر شعبے میں نمایاں اور ممتاز مقام حاصل کر لیا تھا۔ انھوں نے کئی سوسائٹیاں قائم کیں اور اتنی کتابیں اور اتنے مضمون لکھے کہ جن کی مفصل فہرست بنانا بھی ممکن نہیں ہے۔ ان کی تحریروں سے اردو نثر کا ایک نیا دَور شروع ہوتا ہے۔ سرسید نے نہ تو کبھی کسی ایسی مصلحت کو اہمیت دی جو ان کے فیصلے پر اثر انداز ہو اور نہ ہی کسی ایسے مقصد کو انھوں نے اپنایا جو ان کی کوششوں کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہو۔ وہ چیزوں کو ہمیشہ ان کی حقیقی شکل میں دیکھنے کی کوشش کرتے تھے اور بے خوف و خطر دوسروں کی رضا و رغبت کی پروا کیے بغیر اپنے مقصد کی تکمیل میں لگے رہتے تھے۔ ان کی کامیابی کا راز شاید اسی مزاج میں مضمر ہے۔ ان کے اس طریقۂ کار نے ان کے بارے میں بہت سی بدگمانیاں اور شبہات پیدا کر دیے تھے۔ حالانکہ سرسید کو عام طور

پر ایک مسلم مصلح کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے لیکن درحقیقت وہ ایک سچے محبِ وطن تھے۔ سرجان اسٹریچی اپنی کتاب " انڈیا اِٹس ایڈمنسٹریشن اینڈ پروگریس " (India, its Administration and Progress) میں لکھتے ہیں :-

" سرسید کے علاوہ کوئی دوسرا شخص ان اثرات (نسل اور مذہب کے تعصبات) سے اپنے آپ کو اتنا الگ نہیں رکھ سکتا تھا۔ اور نہ ہی سرسید کی طرح کسی نے اپنی ساری زندگی اور اپنے طور طریقوں سے اپنے ہندو ساتھیوں کی عزّت اور ان سے اپنے تعلق کا بھرپور اور عملی ثبوت دیا ہوگا۔"

۱۸۵۹ء میں انھوں نے حکومت کو جو تعلیمی اسکیم پیش کی اس کا مقصد تمام ہندوستانیوں کے لیے ایک اعلیٰ تعلیم کا حصول تھا لیکن وہ ایک حقیقت شناس تھے۔ انھیں اس بات کا علم تھا کہ مسلمان دوسروں سے بہت پیچھے ہیں اس لیے انھوں نے اس اسکیم کو صرف مسلمانوں تک محدود رکھا۔ اس کے علاوہ چونکہ مذہبی رہنما یعنی علما انگریزی تعلیم کے خلاف تھے اس لیے اس تعلیم کو مقبول بنانے کے لیے ایک خصوصی کوشش ضروری تھی۔ اس کام کو ہاتھ میں لے کر وہ اپنے لیے ایک بڑا خطرہ مول لے رہے تھے۔ انھوں نے اس کے لیے اپنی ساری توانائی اور زندگی کے تمام وسائل بازی پر لگا دیے۔ سرجان اسٹریچی لکھتے ہیں کہ " سرسید احمد خاں کو امید تھی کہ علی گڑھ کالج اپنی کامیابی کی مثال قائم کر کے ہندوستان کے قومی اور تعلیمی مسائل کا حل ڈھونڈنے میں مددگار ثابت ہوگا۔"

سرسید مسلمانوں کے انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہونے سے متفق نہیں تھے۔ کانگریس کی طرف سے ان کا یہ رویّہ کانگریس کے بنیادی اصولوں سے کسی اختلاف کی بنا پر نہیں تھا بلکہ اس کا سبب یہ تھا کہ انھیں اس وقت کے مسلمانوں کی خرابیوں کا علم تھا۔ خواجہ الطاف حسین حالؔی جنھوں نے ان کی سوانح عمری لکھی ہے سرسید کا قول دہراتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حکومت سے کوئی مطالبہ کرنے سے پہلے ہمیں اپنے آپ کو

مطالبہ کرنے کا حق دار ثابت کرنا چاہیے۔ انھوں نے مسلمانوں کو ہر حیثیت سے پچھڑا ہوا پایا۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمان کانگریس میں شامل ہو کر کوئی نمایاں کردار ادا نہیں کر سکیں گے اس لیے انھیں پہلے تعلیم یافتہ بنایا جانا چاہیے اور ان میں ذمہ داری کے ساتھ سوچنے اور عمل کرنے کی اہلیت پیدا کرنی چاہیے۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت سے انھیں ایک تلخ تجربہ حاصل ہوا تھا۔ انھیں اس بات کا احساس تھا کہ برطانوی حکومت اتنی طاقتور ہے کہ اس کو اکھاڑ پھینکنا ممکن نہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ ایک کمزور اور غیر منظم قوم کے سیاسی حقوق کے تمام مطالبے بہ ہر حال ردّی ہو جاتے ہیں۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ سرسید کا انتقال کانگریس کے مستحکم اور مقبولِ عام ہونے اور مہاتما گاندھی کی تحریکِ آزادی میں جوش و خروش پیدا ہونے سے قبل ہی ۱۸۹۸ء میں ہو چکا تھا۔ اگر سرسید تحریکِ آزادی کے شباب کے وقت زندہ ہوتے تو ان کا ردِّ عمل شاید بہت مختلف ہوتا۔ کانگریس کے بنیادی اصول جیسے ہندو مسلم اتحاد اور قومی ترقی پر انھیں کامل یقین تھا اس لیے یہ بات کافی وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے لیے جس کام کا بھی انتخاب کرتے اس پر ان کے اعلیٰ صفات کی چھاپ ضرور لگ جاتی۔

سرسید اپنی جدوجہد میں تقریباً اکیلے تھے۔ چند لوگ ہی ان کے سچے اور قابلِ اعتماد دوست تھے جن میں ایک خواجہ الطاف حسین حالؔی تھے اور دوسرے نواب محسن الملک جنھوں نے اپنے قلم اور رقم سے ان کی اعانت کی۔ ان کے علاوہ کچھ اور بھی دوست تھے۔ لیکن بہت کم ایسے تھے جو سرسید سے اتفاق رائے رکھتے ہوں۔ اس کے برخلاف ان کے دشمن اور ان پر نکتہ چینی کرنے والے بہت تھے۔ انھوں نے ان کے دلوں کو جیتنے کی بہت کوشش کی اور ہمیشہ یہی چاہا کہ بغیر کسی جھگڑے کے اپنا مقصد حاصل کر لیں لیکن جب کبھی لڑائی ناگزیر ہوئی تو انھوں نے اپنے مخالفین سے بے خوف ہو کر اپنی ذہانت کے بل بوتے پر مقابلہ کیا۔ ایک طرف مذہبی امور میں مولویوں

کا مقابلہ کیا اور انھیں سمجھانے کی بھر پور کوشش کی۔ دوسری طرف انھیں ان مورخوں کا بھی مقابلہ کرنا پڑا جنھوں نے مسلمانوں اور پیغمبرِ اسلام کے خلاف غلط الزامات عائد کیے تھے۔ انھوں نے قانون پر بھی اسی اعتماد کے ساتھ قلم اٹھایا جس اعتماد کے ساتھ وہ سیاست پر لکھتے تھے۔ وائسرائے کی کونسل اور پبلک سروس کمیشن کے وہ بہت سرگرم رکن رہے۔ جلسوں کو خطاب کرتے وقت اور عظیم شخصیتوں کی ملاقاتوں کے درمیان انھوں نے ہمیشہ اپنی شخصیت سے دوسروں کو متاثر کیا ہے۔ حکومتِ ہند ان کا احترام کرتی تھی۔ اس نے انھیں اعزاز بھی دیے ہیں۔ ۱۸۸۸ء میں حکومت نے انھیں کے۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ (نائٹ کمانڈر آف دی اسٹار آف انڈیا) کا خطاب دیا۔ ۱۸۸۹ء میں ایڈنبرا یونیورسٹی نے انھیں ایل۔ ایل۔ ڈی۔ کی اعزازی ڈگری عطا کی۔

سر جان اسٹریچی لکھتے ہیں کہ "مجھے انھیں اپنا دوست کہنے پر فخر تھا۔ کسی اور نسل یا کسی اور ملک کے آدمی کے لیے میرے دل میں اتنا احترام نہیں تھا جتنا کہ سر سید کے لیے تھا۔ ان سے میری پہلی ملاقات ۱۸۵۷ء کے غدر کے کچھ ہی دنوں بعد مراد آباد میں ہوئی۔ اس وقت وہ ہندوستانی ججوں میں ایک ممتاز جج تھے اور ان کا کردار بھی کسی انگریز کے اعلیٰ کردار سے کم نہ تھا۔ کوئی انگریز سر سید سے زیادہ اعتماد اور ذمہ داری کے ساتھ نہیں بول سکتا تھا۔ کوئی دیسی باشندہ یا خود انگریز اپنی دانش مندی اور اعلیٰ کرداری کی بنا پر اس قدر قابلِ احترام نہیں تھا جتنا کہ سر سید تھے۔"

سر سید ہندوستان کے ایک عظیم سپوت تھے۔ انھوں نے اپنی ساری زندگی خدمتِ خلق کے لیے وقف کر دی تھی۔ مذہبی امور میں وہ وسیع النظر تھے اور تمام قوموں کی بھلائی کے خواہاں تھے۔ وہ جدید طرزِ تعلیم کے زبردست حامی تھے۔ وہ زندگی کی اعلیٰ اخلاقی قدروں میں یقین رکھتے تھے اور عام زندگی میں دیانت داری، صداقت اور بلند اخلاقی کی تلقین کرتے تھے۔ اُن کے ان اعلیٰ اصول و نظریات کی ہمیشہ قدر و منزلت ہوگی۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

نوٹ: طلبہ و اساتذہ کے لیے خصوصی رعایت۔ تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

آصف سابع میر عثمان علی خاں (بچوں کے لیے)

مصنفہ:
طیبہ بیگم
صفحات : 56
قیمت : -/12 روپے

اقبال اور بچوں کا ادب

مصنفہ:
زیب النساء بیگم
صفحات : 216
قیمت : -/60 روپے

حالی

مصنف:
صالحہ عابد حسین
صفحات : 68
قیمت : -/15 روپے

ہمارے ٹیگور

مصنف:
صفدر حسین
صفحات : 112
قیمت : -/15 روپے

ہمارے رہنما

مترجم:
فرحت قمر
صفحات : 149
قیمت : -/35 روپے

ڈاکٹر راجندر پرشاد

مصنف:
عبداللطیف اعظمی
صفحات : 41
قیمت : -/10 روپے

ISBN: 978-81-7587-314-8

कौमी काउन्सिल बराए फरोग़-ए-उर्दू ज़बान

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

National Council for Promotion of Urdu Language
West Block-1, R.K. Puram, New Delhi-110066